مثنوی معنوی:مولانا روم کے تصور روح کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

Masnvi Maanvi:A Research and Critical Review of Mulanarum's Concept of Spirit

Muhammad Saleem Sarwar
PhD Research Scholar, Department of Urdu, National University of Modern Languages (NUML), Islamabad:
chandbhatti187@gmail.com

Dr. Robina Shahnaz
Visiting Prof., Department of Urdu, Muslim Youth University, Islamabad:
rshanaz1958@gmail.com

Abstract:

Maulana Rumi is the only person in the world of Sufism who achieved perfection in Sufism as much as he made a name for himself in religion and worldly education. It was known that the problem that was not solved in the neighborhood people used to come to him. Maulana has tried to explain the religious problems to the public in a general metaphorical manner considering the necessity of human life. One of the problems described by Maulana is the concept of soul, but this problem is not only in the religion of Islam but also in other religions It is so debatable. Maulana has explained the problem of soul in a very simple and clear way. We have discussed about Maulana's concept of soul after a brief introduction of Maulana and Masnavi in the proposed article.

Keywords: *Maulana Rumi, Sufism, Masnavi, Religion, Islam, Spirit*

مولانا روم ۶۰۴ھ بمطابق ۱۲۰۷ء کو بلخ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ بہاء الدین ہے۔ آپ کا نام محمد، لقب، جلال الدین، خطاب خداوند گارا اور عرف مولانا رومی ہے۔ تمام تذکرہ نویسوں نے مولانا کا سلسلہ نسب بلا استثنا حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جوڑا ہے۔ مولانا رومی کے سلسلہ نسب کے حوالے سے قاضی تلمذ حسین اپنے مضمون "صاحب المثنوی" میں لکھتے ہیں:

"مولانا جلال الدین رومی، بن مولانا بہاء الدین (سلطان العلما) بن حسین بن احمد بن مودود بن ثابت بن مسیب بن مطہر بن حماد بن بن عبد الرحمن بن ابو بکرؓ۔"[1]

مولانا کے آباؤاجداد بلخ موجودہ خراسان کے رہنے والے تھے اور مولانا رومی بھی بلخ میں ہی پیدا ہوئے مگر خداوند کریم کی مشیت کے مولانا کو بلخ سے نکال روم (قونیہ) میں پہنچا دیا اور قونیہ مولانا کا مسکن و مدفن ٹھہرا۔

مولانا جلال الدین رومی نے ایک پاکباز گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جس گھرانے کا ہر لمحہ ہی یہی کام تھا کہ وہ اپنی ذات کا تزکیہ کرتے رہتے تھے۔ مولانا پر اس تربیت کا یہ اثر ہوا کہ وہ علم اور شوق کی دنیا میں مزید سے مزید کے متمنی ہوتے گئے، ہمہ وقت خود کو مصروف رکھتے اور بزرگوں کی عزت اور ان کی تعظیم کرنا انھوں نے اپنا ابتدائی فرض سمجھ رکھا تھا۔ مولانا کو ابتدائی تعلیم ان کے والدِ گرامی نے دی اور پھر والدِ گرامی کے مرید سید برہان الدین نے دنیاوی علوم سے بچپن میں ہی سرفراز کر دیا تھا۔ مولانا بچپن میں اپنے والد گرامی کے ساتھ نیشاپور گئے تو وہاں پر ان کی ملاقات شیخ عطار سے ہوئی تو انھوں نے مولانا کے پُر جلال مستقبل کی نوید سنائی اور مولانا کو اپنی کتاب تحفے میں دی اور مولانا نے ہمیشہ شیخ عطار اور ان کی دی ہوئی کتاب کو دل میں جگہ دی۔ مولانا رومی سپیشل نمبر میں سید عابد علی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"شیخ بہاالدین جب نیشاپور پہنچے تو وہاں فرید الدین عطار سے ان کی ملاقات ہوئی۔ کہا جاتا ہے شیخ عطار نے مولانا جلال الدین رومی کو دیکھا تو ان کے پر جلال مستقبل کی پیش گوئی کی اور اپنی کتاب 'اسرار نامہ' بطورِ تحفہ عنایت کی۔ مولانا رومی اس کتاب کو حد درجہ عزیز رکھتے تھے۔"[2]

---

[1] تلمذ حسین قاضی، صاحب المثنوی مشمولہ، اسلام اور عصر جدید (خصوصی شمارہ نذر رومی)، ذاکر حسین انسٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، جامعہ ملیہ نئی دہلی، ۲۰۰۷، ص ٦

[2] سید عابد حسین، اسلام اور عصر جدید (خصوصی شمارہ نذر رومی)، ذاکر حسین انسٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، جامعہ ملیہ نئی دہلی، ۲۰۰۷، ص ٦

مولانا رومی صوفیا میں سے واحد بزرگ تھے علوم باطنی کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم میں بھی برابر کمال رکھتے تھے۔ ان کے علم کا چرچا قرب وجوار میں ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ مولانا روم شہر کی جامعہ مسجد میں خطیب تھے۔ لیکن ان کی زندگی خاموش دریا کی طرح ایک عرصے تک چلتی رہی مگر اس ٹھہرے ہوئے دریا میں اس وقت پہلا انقلاب پیدا ہوا جب انھوں نے خواب دیکھنے شروع کیے۔ مولانا کی زندگی میں پہلی جھلک اس وقت نمودار ہوئی جب انھوں نے چالیس دن تک مسلسل ایک ہی خواب دیکھا۔ مولانا رات کے پہر جب خواب دیکھتے تو ان کی حالت عجیب ہو جاتی اور ان کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔ مولانا کی ایسی حالت پر ان کی بیوی کیرا اکثر جاگ جاتیں اور مولانا کو راحت محسوس کرنے کو کہتی مگر مولانا ان کو دوبارہ سونے کو کہتے اور خود اصل روشنی کی تلاش میں رہتے۔ اب مولانا روم کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہونے جا رہا ہے۔ اس حوالے سے محمد اکرم چغتائی اپنی مرتبہ کتاب میں لکھتے ہیں:

"ان کی زندگی کا دوسرا دور درحقیقت شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے۔۔۔ یہ عجیب بات ہے کہ شمس تبریز کی ملاقات کا واقعہ مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ تذکروں اور تاریخوں میں اس قدر مختلف اور متناقض طریقوں سے منقول ہے کہ اصل واقعہ کا پتہ لگانا مشکل ہے۔"[3]

مولانا روم کو بچپن سے دین و دنیا کی علمی دولت سے بہرہ ور استاد میسر رہے اور پھر شمس تبریز جیسے مرشد مقدر بنے وہاں شاگردوں اور مریدوں کی بھی بہتات رہی اور شاگرد اور مرید ایسے جانثار تھے کہ وہ مولانا پر اپنی دنیا قربان کیے ہوئے تھے ان مریدوں میں سے ایک حسام الدین چلپی بھی تھے جن کی فرمائش اور خواب کی تعبیر کی صورت میں مثنوی معنوی وجود میں آئی۔ مولانا کی تین تصانیف زیادہ مشہور ہیں ان کا مختصر سا تعارف ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے اور آخر میں مثنوی کا تعارف قدرے تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔

[3] محمد اکرام چغتائی، مولانا جلال الدین رومیؒ حیات و افکار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء ص ۱۲

فيه مافيه

مولانا روم کی یہ تصنیف خطوط کا مجموعہ ہے۔ مولانا روم کی اس تصنیف کے بارے ایک رائے یہ بھی ملتی ہے کہ اس میں بہتر (۷۲) مقالات درج ہیں اور انگریزی میں ترجمہ شدہ ایڈیشن میں اکہتر مقالات ہیں۔ تاہم شبلی نعمانی کی رائے زیادہ معتبر نظر آتی ہے وہ اپنی تصنیف ''سوانح مولانا روم'' میں لکھتے ہیں:

''فيه مافيه ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کے نام لکھے یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔ سپہ سالار نے اپنے رسالے میں ضمناً اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا کے دیوان کا ایک مختصر سا انتخاب ۱۳۰۹ھ میں امرتسر میں چھپا ہے۔ اس کے خاتمے میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں تین ہزار سطریں ہیں۔''[4]

دیوان:

مولانا روم کی غزلوں پر مشتمل تصنیف جس میں شامل تمام مواد غزلوں پر مشتمل ہے۔ مولانا شبلی نعمالی کے مطابق اس میں پچاس ہزار اشعار ہیں۔ غزلوں کے مقطع میں شمس تبریز کا نام لکھا ہوا ہے اس لیے اکثر قارئین یہ غلطی کرتے ہیں کہ اسے شمس تبریز کا دیوان سمجھ لیتے ہیں۔ موجودہ دور کی شاعری اور غزل کی روایت کے برعکس مولانا روم نے اپنی غزلوں میں موضوع کے حوالے سے نظم کا سا تسلسل برتا ہے۔

مثنوی معنوی کا تعارف:

مولانا روم کا شمار ان صوفیا میں ہوتا ہے جو قولی، فعلی، تقریری اور تحریری تمام جہات میں باطنی صفات سے متصف نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان کی تمام اصناف میں تصوف کی جھلک نظر آتی ہے۔ موضوع کو مد نظر رکھتے ہوئے مثنوی معنوی کی طرف آتے ہیں۔ مثنوی معنوی چھے بسیط دفتروں پر مشتمل ہے،بجزو پہلے دفتر کے تمام کا آغاز حسام

---

[4] شبلی نعمانی مولانا، سوانح مولانا روم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء ص ۶۱

الدین چلپی کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے مولانا روم کو اس مثنوی کی تحریر کی طرف حسام الدین چلپی نے راغب کیا تھا۔ ایک شام حسام الدین مولانا کی خدمت میں حاضر تھے تو کہنے لگے مولانا آپ بھی منطق الطیر کی طرز پر کوئی مثنوی لکھیں اور مولانا نے کہا میں نے بھی خواب میں یہی دیکھا ہے۔ مولانا روم نے شریعت، طریقت، حقیقت اور تصوف کے امور کو جس قدر پر خلوص انداز میں بیان کیا ہے اس قدر ہی مقبولیت ان کا مقدر بنی۔ مثنوی کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی اس قدر مقبولیت فارسی کی کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ مثنوی کی مقبولیت کے حوالے سے صاحب "**مجمع الفصحا**" کا ایک قول:

"ایران میں چار کتابیں جس قدر مقبول ہوئیں کوئی کتاب نہیں ہوئی، شاہنامہ، گلستان، مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ، ان چاروں کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح ہو گی۔ مقبولیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ علماء و فضلاء نے مثنوی کے ساتھ جس قدر اعتنا کی اور کسی کتاب کے ساتھ نہیں کی۔"[5]

مثنوی کی ترتیب

مثنوی سے پہلے اخلاق و تصوف کے حوالے سے جو کتابیں لکھی گئیں وہ اخلاق و تصوف کے مختلف عنوانات کے نام سے ترتیب دے کر لکھی گئیں مثلاً "منطق الطیر" اور "بوستان" اور "حدیقہ" میں بھی اسی ترتیب کو مد نظر رکھا گیا ہے مثلاً عقل، نفس، روح، معرفت، وجد، صبر، شکر اور توکل وغیرہ کو موضوع بنا کر مسلسل لکھا گیا ہے۔ مگر مولانا روم نے اس ترتیب کو سامنے نہیں رکھا بلکہ قرآن کی طرح ٹکڑوں میں دفتروں میں مضامین کو بیان کر دیا ہے۔ مثنوی معنوی چھے بسیط دفتروں پر مشتمل ہے۔

---

[5] ایضاً ص ۶۷

مثنوی کے اہم نکات کا جائزہ:

مثنوی کی سب بڑی خصوصیت مولانا کا اختیار کردہ استدلالی اور عام فہم انداز جس نے مثنوی کو عام و خاص میں مقبول بنادیا ہے۔ مولانا نے بوقتِ ضرورت اور مخاطب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تمثیلی انداز بھی اپنایا ہے۔ طرزِ استدلال کے تین طریقے ہیں قیاس، استقراء اور تمثیل۔ ان تینوں میں سے ارسطو نے قیاسی انداز کو ترجیح دی ہے اور علمائے اسلام نے بھی زیادہ تر قیاسی طرز انداز ہی اپنایا ہے۔ مولانا روم نے بھی زیادہ تر اسی قیاس تمثیلی سے کام لیا ہے۔ مثنوی میں اخلاقی مسائل کو سمجھانے کے لیے فرضی حکایات سے کام لیا گیا ہے مگر ان حکایتوں کو منطقی استدلال کے ذریعے کمالِ عروج پر پہنچا دیا۔ مثنوی کے شروع میں اپنے عیب نہ دیکھنے اور دوسرے کے عیب دیکھنے کے حوالے سے شیر اور خرگوش کی تمثیل پیش کی گئی ہے اور اس تمثیل سے منطقی نتیجہ یہ نکالا ہے کہ دراصل دوسروں کے عیب دیکھنے والا دراصل خود اپنے اوپر ہی حملہ آور ہو رہا ہوتا ہے جیسے اس تمثیل میں شیر اپنا عکس دیکھ کر کنواں میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا اور جان سے چلا جاتا ہے۔

مختلف فرقوں میں جو اختلاف ہے مولانا اس اختلاف کو صرف لفظی اختلاف مانتے ہیں اور اس اختلاف کو ایک تمثیل کے ذریعے اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ایک آدمی نے چار آدمیوں کو ایک درہم دیا اوران میں سے ایک ترک، ایک ایرانی، ایک رومی اور ایک عرب تھا۔ وہ چاروں لوگ شہر جاکر اپنی اپنی زبان میں انگور طلب کرتے ہیں۔ اس بات پر چاروں میں جھگڑا ہو جاتا ہے کیونکہ چاروں کے الفاظ جدا جدا تھے اور وہ سمجھ رہے تھے یہ لوگ مختلف چیزوں کی مانگ کر رہے ہیں حالانکہ وہ ایک ہی چیز کے خواہاں تھے۔ مولانا کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا آتا جو ان کو کہتا کہ تم ایک ہی چیز کے طالب ہو تو ان کے درمیان مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اس تمثیل سے مولانا یہ ثابت کرتے ہیں کہ تمام لوگ خدا ہی کے طالب ہیں مگر طریقوں کے اختلاف کی وجہ سے آپس میں الجھ رہے ہیں۔

علم کلام:

مثنوی کو تصوف کا فن پارہ سمجھ کر مقبولیت دی گئی ہے حالانکہ تصوف اور طریقت کے ساتھ ساتھ عقائد اور علم کلام کا بھی یہ ایک گوہر نایاب ہے۔ موجودہ علم کلام کی بنیاد امام غزالی نے رکھی اور امام رازی نے اس عمارت کو عرش کمال تک پہنچا دیا۔ امام غزالی اور رازی کے دور سے لے کر آج تک ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ مسائل عقائد جس خوبصورتی اور دانائی سے مولانا روم نے بیان کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ذات باری:

خدا کے اثبات کے مختلف طریقوں میں سے مولانا نے وحدۃ الشہود والا طریقہ اپنایا ہے۔ یہ طریقہ خطابی ہے اور عوام کے لیے یہ طریقہ زیادہ مناسب بھی ہے۔ کیونکہ کائنات کے مظاہر چاند، ستارے، سورج، پھول، دریا اور نہروں وغیرہ کو دیکھ کر اس بات کا یقین کر لینا آسان ہے کہ کوئی ہاتھ تو ہے جو ان کو بنا رہا ہے اور چلا رہا ہے۔ اس کو مولانا اس طرح بیان کرتے ہیں:

"دست پنہاں و قلم بیں خط گداز
اسپ در جولان و ناپیدا سوار
پس یقین در عقل ہر داننده ست
اینکه با جنبیده جینا ننده است"[6]

[6] جلال الدین رومی، مولانا، مثنوی معنوی، دفتر اول مترجم (قاضی سجاد حسین) اسلامی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۶، ص ۱۸

ذات باری تعالیٰ کے اثبات کے حوالے دوسرا انداز کائنات کی ترتیب کے حوالے سے ہے مولانا اس طریقے سے بھی ذات باری تعالیٰ کے اثبات کو ثابت کیا ہے۔ مولانا نے جو دلائل دیے ہیں ان سے خدا کی ذات کے ساتھ ساتھ خدا کی صفات بھی ثابت ہوتی ہیں۔

روح:

مولانا کہتے ہیں طالب کی روح پر نبی کی نظر کا ایسا اثر ہوتا ہے جیسے اسے جان مل گئی ہو۔ مولانا کا ماننا ہے کہ اصل معجزات خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہدایت اور نبی ﷺ کی روحانی طاقت۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَيَسْـئَلُونَكَ عَنْ الرُّوحِ قُلْ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّى"[7]

اور پیغمبر یہ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے"۔

نبوت کے بعد مکہ کی زندگی میں مکہ کے کفار نے یہودیوں کے اکسانے پر نبی ﷺ سے روح کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے سورہ بنی اسرائیل کی درج بالا آیت نازل فرمائی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روح اللہ کا ایک حکم ہے جو انسان کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی جسم سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور پھر اللہ کے حکم پر قیامت کے دن دوبارہ حاضر ہو کر تمام سوالات کے جوابات دے گا۔

روح کا مسئلہ بنیادی عقائد میں سے ایک ہے کیونکہ روح کے وجود کا تعلق معاد سے بھی منسلک ہے۔ مسلمان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا کی زندگی کے خاتمے کے بعد ایک اور زندگی دی جائے گی جہاں انسان کے اعمال کا

[7] بنی اسرائیل، آیت ۸۵

حساب ہو گا اور انہی اعمال کی بنیاد پر جنت جہنم کا فیصلہ ہو گا۔ روح کا مسئلہ تمام مذہبی امور کی بنیاد ہے مثلاً خدا کے وجود کا اقرار، نبوت کا اعتراف، کائنات کا نظام اور آخرت میں جزا و سزا پر یقین اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے جب ہم روح کے دوبارہ زندہ ہونے پر یقین رکھیں گے۔ مولانا روم نے اس مسئلے کو بڑی توجہ سے برتا ہے اور مثنوی میں کئی مقامات پر روح کی حقیقت، حالت اور خواص سے بحث کی ہے۔ روح کے بارے میں اہلِ علم کی مختلف رائیں سامنے آتی رہی ہیں۔ طبیعات کے ماہرین، جالینوس اور فیثا غورث کا یہ ماننا ہے کہ روح کوئی الگ چیز نہیں بلکہ ترکیبی عناصر سے جو کوئی خاص چیز پیدا ہوتی ہے اسی کا نام روح ہے۔ افلاطون اور دیگر حکماء نے اس بات کو مانا ہے کہ روح جسم سے الگ چیز جو ایک آلہ کے طور پر جسم سے کام لیتی ہے اور جسم کے فنا ہونے سے روح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بو علی سینا، امام غزالی اور صوفیہ اور حکمائے اسلام کا یہی مذہب ہے اور مولانا روم بھی روح کے بارے میں اسی طرح کا نظریہ رکھتے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ ادراک کی وجہ سے روحوں میں درجوں کا افتراق موجود ہوتا ہے۔ اس افتراق کی صورت کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا کہتے ہیں جمادات سب سے کم تر درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کے نچلے ترین درجے پر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے عناصر میں کمزور ترین ترکیب ہوتی ہے۔ جمادات کے بعد نباتات کا نمبر آتا ہے۔ نباتات کی لاکھوں قسمیں ہیں اور پھر ان میں بھی روح کے مختلف درجے ہیں مگر ان میں ادراک کا وصف نہیں ہوتا ہے اس لیے یہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ نباتات کے بعد حیوانات کا نمبر آتا ہے۔ حیوانات میں سے روحانیت کا آغاز ہوتا ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں کہ روح کے مراتب میں فرق ہوتا ہے اور اس فرق کی بنیادی وجہ ادراک کی صفت ہے تو اسی بنیاد پر مولانا بڑا دلچسپ نکتہ سامنے ہیں کہ انسانوں میں بھی ادراک کے مراتب مختلف ہوتے ہیں اور اسی بنا پر ان کی روحوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس حوالے سے مولانا فرماتے ہیں:

"جان چه باشد؟ باخبر از خیر و شر

شاد ازاحسان و گریاں از ضرر

چوں سرد ماہیت جاں مخبر است

ہر که او آگاه تر باجاں تراست

اقتضائے جاں چو ایدل آگہیست

ہر کہ آگاہ تر بود جانش قوی ست

جان ما از جان حیواں بیشتر

ازچه رو؟ زاں کو فزوں دارد خبر

پس فزوں از جان ما جان ملک

کو منزہ شد زحس مشترک

بے جہت داں عقل علام البیاں

عقل تراز عقل وجاں تر ہم زجاں"[8]

روح حیوانی بھی ادراک رکھتی ہے مگر وہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھتی اور جس حد پر وہ روح رک جاتی ہے وہاں سے آگے انسانی روح کا آغاز ہوتا ہے۔روح انسانی عقل اور ادراک کے معاملے میں جمادات،نباتات اور حیوانات سے بلند تر درجے پر فائز ہے جو خدا کا ادراک ان سب سے بہتر طور پر رکھتی ہے۔

مولانا کا ماننا ہے کہ روح کی سب سے بڑی صفت ادراک ہے اور پھر ادراک کی وجہ سے روحوں کے مختلف مراتب ہیں جس میں سب سے کم درجے پر جمادات ہیں اور سب سے بہتر ارواح وہ ہیں جو سب سے زیادہ خدائی ادراک رکھتی ہیں۔اس حوالے سے مولانا فرماتے ہیں:

"روح را تاثیر آگاہی بود

ہر کرا ایں بیش! للہی بود

[8] جلال الدین رومی،مولانا،مثنوی معنوی،دفتر اول مترجم (قاضی سجاد حسین) اسلامی کتب خانہ،لاہور،۱۹۷۶،ص ۲۳

جاں نباشد جز خبر در آزموں

ہر کرا فزوں خبر جانش فزوں"[9]

مولانا روم کہتے ہیں جس میں ادراک زیادہ ہے اس میں روح زیادہ مضبوط ہے۔ روح کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ روح حیوانی سے ہے جو انسان میں موجود ہے۔ یہ تعلق اس قسم کا ہے جس طرح آفتاب کا آئینہ سے۔ آفتاب اپنی جگہ موجود ہے لیکن اس کا عکس آئینہ پر پڑتا ہے اور اس کو روشن کر دیتا ہے۔ اسی طرح روح عالم ملکوت میں ہے۔ اس کا عکس روح حیوانی پر پڑتا ہے اور اسی عکس کی وجہ سے انسان مختلف قوا کا مظہر بن جاتا ہے۔ مولانا روم روح مثنوی میں روح کی جن صفات کا ذکر کرتے ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

روح ایک مجرد جوہر ہے جو جسم کی نعمت سے محروم ہے۔ اس مجرد جوہر کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ اس جسم میں موجود حیوانی روح سے ہے جو انسان میں موجود ہے۔

روح ایک ہی مرتبے پر ہمیشہ ٹھہرتی نہیں بلکہ اس کے مراتب میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور یہ سلسلہ وار ترقی کرتی رہتی ہے۔ روح کی ترقی بعض اوقات اس قدر بلند درجے پر پہنچ جاتی ہے جہاں سے وہ عام انسانی روح سے اس طرح مختلف ہو جاتی ہے جس طرح انسانی اور حیوانی روح مختلف ہیں، روح کی اس بلند ترین سطح کو نبوت کا درجہ نصیب ہوتا ہے۔ روحوں کے مدارج میں افتراقات کے حوالے سے علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

"دیکھیے ہم نے انبیاء، صحابہ، اور ائمہ کے اجسام نہیں دیکھے۔ حالانکہ وہ ہمارے علم میں شخصی خصوصیات کے مالک ہیں۔ یہ امتیازی خصوصیات محض ان کے اجسام ہی کے نتائج نہیں۔ گو ان کے اجسام کی خصوصی صفتیں بتادی گئی ہیں۔ بلکہ ان کی ارواح کی صفات و عوارض کے نتائج ہیں۔ صفات کے اعتبار سے اجسام سے زیادہ ارواح میں تشخص

---

[9] جلال الدین رومی، مولانا، مثنوی معنوی، مترجم دفتر سوم (قاضی سجاد حسین) اسلامی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۶، ص ۷۸

ہے۔ دیکھتے نہیں کہ مومن و کافر کے جسم بہت سی باتوں میں ملتے جلتے ہیں۔ لیکن روحوں میں عظیم ترین فرق و امتیاز ہے۔"[10]

انسان کا جسم اس لیے کام کرتا رہتا ہے کہ اس پر روح کا عکس ہوتا ہے بالکل اسی طرح انسانی روح عالم قدس کا پرتو ہوتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ انسان میں جو روح حیوانی ہے وہ اس کے کام کرنے کا آلہ ہے جسے جان کہتے ہیں مثلاً جس طرح ایک کاریگر اپنے آلہ کے بغیر کام نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح روح کو بھی کام کرنے کے لیے روح حیوانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اپنے طور پر روح ایک الگ شے ہے۔ روح نہ مادہ ہے اور نہ مادے کا مرکب ہے اس لیے اس روح کو فنا نہیں۔ انسان اسی روح کا نام ہے اور یہ روح روح حیوانی اور جسم کے قالب میں بند ہے۔

معاد:

اللہ تعالیٰ پر یقین کرنا کہ وہی ذات ہے جس نے پہلی بار انسان کو پیدا کیا اور دوسری بار بھی وہی پیدا کرے گا اور انسان کے اعمال بد کے بدلے میں دوزخ اور نیک اعمال کے بدلے میں جنت کا فیصلہ کرے گا یہی معاد کہلاتا ہے۔ آخرت پر یقین سے دنیا میں اخلاقی پہلو قائم رہتے ہیں اگر دنیا والے اس بات کو مان لیں دوبارہ زندگی نہیں ہوگی تو اچھائی اور برائی میں تمیز بھول جائیں۔ اس اہم موضوع کو علم کلام کی کتابوں میں متکلمین نے جس طرح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس سے نہ صرف یقین میں ضعف پیدا ہوتا ہے بلکہ فطری وجدان میں بھی ہلچل مچ جاتی ہے۔

متکلمین کی جماعت نے اس بات پر اتفاق کا اظہار کیا ہے کہ روح کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ جسم کے ترکیبی عناصر سے جو قوت جنم لیتی ہے اسی کا نام روح ہے اور یہ روح جسم کے ساتھ ہی تباہ ہو جاتی ہے۔ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ جسم کو دوبارہ زندہ کرے گا تو روح بھی دوبارہ سے زندہ ہوگی۔ متکلمین کی یہ بات شریعت سے کوئی ربط

---

[10] ابن قیم علامہ، مترجم (مولانا راغب رحمانی)، کتاب الروح، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء ص ۹۳

نہیں رکھتی مگر ان لوگوں نے اس پر اس قدر زور دیا کہ معدوم ہونے والے جسم کو دوبارہ سے اسی طرح پیدا ہوتا ہوا ثابت کر دیا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کے نزدیک یہ لوگ صریح غلطی پر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ روح جسم سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہتی۔ جب یہ لوگ روح کے جسم سے علیحدہ ہو کر زندہ رہنے پر یقین نہیں رکھتے تو اس کا مطلب ہے یہ لوگ برزخ میں عذاب کے بھی منکر ہیں۔ علامہ ابنِ قیم اپنی کتاب "کتاب الروح" میں فرماتے ہیں:

"یہ معتزلہ اور اشعریہ وغیرہ کا قول ہے۔ یہ لوگ بدن سے جدا ہونے کے بعد روح کی بقا کے قائل نہیں۔ یہ قول باطل ہے ابولمعالی الجوینی وغیرہ نے اس کی مخالفت کی ہے بلکہ کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے کہ روح بدن سے جدا ہونے کے بعد زندہ رہتی ہے اور اس پر عذاب و ثواب ہوتا ہے۔"[11]

مولانا روم نے متکلمین کی جماعت کے برعکس اس بات کو یوں ثابت کیا کہ روح جسم سے الگ چیز ہے۔ روح جسم کے ساتھ تباہ نہیں ہوتی بلکہ یہ سلامت رہتی ہے اور اس تشریح مولانا اس طرح کرتے ہیں کہ جسم کے خاتمے پر روح کو ایسے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے ایک کاریگر کے آلے کے جاتے رہنے سے ایک کاریگر کو نقصان یا دکھ ہوتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے تو معاد کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا مگر مسئلہ یہاں پر ہوتا ہے جہاں جب متکلمین کہتے ہیں جسم کی تباہی پر روح کے زندہ رہنے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے اور مولانا نے اس غلط فہمی کو مختلف مثالوں اور تشبیہوں سے رفع کیا ہے۔ عمر خیام نے اپنی ایک رباعی میں لطیفے کے طور یہ کہا تھا کہ انسان کوئی گھاس نہیں کہ جسے ایک بار کاٹ لیا جائے اور پھر اگ آئے۔ مولانا اس بات کا جواب اس انداز میں دیتے ہیں:

"کدام دانه فرورفت درزمیں که نه رست

چرا به دانه انسانت ایں گماں باشد"[12]

---

[11] ایضاً ص ۱۰۸

[12] جلال الدین رومی، مولانا، مثنوی معنوی، مترجم دفتر دوم (قاضی سجاد حسین) اسلامی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۶، ص ۴۲۳

عمر خیام نے اگرچہ لطیفہ ہی کہا مگر اس میں علمی استدلال موجود تھا اور مولانا نے اس بات کا استدلالی انداز میں یوں جواب دیا ہے کہ انسان پہلے جمادات تھا، پھر نباتات اور نباتات سے حیوان اور پھر حیوان سے انسان بنا۔ اس بات کو مولانا یوں بیان کرتے ہیں:

"آمده اول به اقلیم جماد — از جمادی درنباتاتی اوفتاد
سالہا اندرنباتی عمرکرد — وزجمادی یاد ناورد ازنبرد
وزنباتی چو به حیواں او فتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تاشد اکنوں عاقل و دانا وزفت
عقلہائے اولینش یاد نیست — ہم ازیں عقلش تحول کردنی ست
گرچه خفته گشت وناسی شد زپیش — کے گزارندش دراں نسیان خویش
بازازاں خو ابش به بیداری کشند — که کند برحالتِ خودریشخند"[13]

انسان کی پیدائش کا یہ طریقہ مذہباً اور حکمتہً ثابت ہے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے قرآن سے اس آیت کا حوالہ پیش کرتے ہیں جس میں لوتھڑے سے انسان کے بننے کے مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ترکیب فلسفہ کے بھی موافق نظر آتی ہے۔ڈارون کے نظریہ کے مطابق بھی انسان جمادی، نباتاتی، حیوانی حالتوں سے گزر ہی انسان بنا ہے۔ مولانا اور ڈارون کے نظریے میں فرق یہ ہے کہ ڈارون روح کا قائل نہیں اور مولانا روح کے قائل ہیں۔ ڈارون انسان کو باقی جانوروں کی طرح ہی ایک مخلوق مانتا ہے جیسے شیر، گیدڑ، ہاتھی وغیرہ مگر مولانا روم انسان کو جانوروں سے انسان کو بہتر مخلوق گر دانتے ہیں۔ انسان جب جماد سے نباد اور نباد سے حیوان اور حیوان سے انسان بنا تو اب اس حالت سے مزید ترقی کر کے کوئی اور حالت بنے۔ مولانا کہتے ہیں کہ کسی چیز کے فنا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ

---

[13] ایضاً، ص:۳۴۲

وہ سرے سے معدوم ہو جائے، بلکہ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ کی طرف جانے کے لیے یک بار فنا ہونا ضروری ہے۔ مولانا نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے تفصیل سے ترقی کے عجیب وغریب مدارج بیان کیے ہیں۔ مولانا نے اس بات کو عام فہم مثالوں سے بیان کیا ہے:

"تو ارزاں روزے که در ہست آمدی　　آتشی یا خاک یا بادی بدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا　　که رسیدے مرترا ایں ارتقا
ازل مبدل ہستی اول نماند　　ہستی دیگر بجائے او نشاند
ہم نچیں تاصد ہزاراں ہست ہا　　بعد یک دیگر، دوم به ز ابتدا
ایں بقاہا از فنا با یافتے　　از فنا پس رو چرا تر بافتے
زاں فنا باچه زیاں بودت که تا　　بربقا چسپیده اے بے نوا"[14]

مولانا کا یہ ماننا ہے کہ اصل بقا فنا ہی میں پوشیدہ ہے کیونکہ ایک حالت کی تباہی سے دوسری بہتر حالت نمودار ہوتی ہے۔ اس بات کا استدلال تو قرآن اور احادیث میں بھی موجود ہے کہ اخروی زندگی بہتر اور لافانی زندگی ہے۔

ایک فرقہ یہ بات بھی سامنے لاتا ہے کہ کائنات اپنا مقصد آپ ہے اور اس لیے دوبارہ زندگی کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا اس بات کا جواب بھی بڑی فصاحت کے ساتھ مختلف مثالوں سے دیتے ہیں کہ کوئی چیز بھی اپنی غرض آپ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کائنات کے بہترین نظام پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آخر کوئی تو ہے جو مدبر اور بہترین منتظم ہے جو اس کائنات کو بنا کر بہترین صورت میں چلا بھی رہا ہے۔ کائنات کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے مولانا کہتے ہیں کہ کوئی بھی مصور اس لیے

[14] جلال الدین رومی، مولانا، مثنوی معنوی، مترجم (قاضی سجاد حسین) اسلامی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۶، ص ۲۶

تصویر نہیں بناتا کہ وہ خود ہی دیکھتا رہے بلکہ اس لیے بناتا ہے کہ لوگ اس دیکھیں اس کی تعریف کریں اور اس کے بدلے اس کو مالی منفعت بھی حاصل ہو۔

اس کے بعد مولانا کوزے کی مثال دیتے ہیں کہ کوئی بھی کوزہ گر اس لیے کوزہ نہیں بناتا کہ وہ صرف اپنی ذات کے لیے ہو بلکہ ہر کوزہ گر اس لیے کوزہ بناتا ہے کہ وہ پانی کے لیے استعمال کیا جائے۔اس کے بعد مولانا پیالے کی مثال دیتے ہیں کہ پیالہ اس لیے بنایا جاتا ہے کہ لوگ اس سے پانی پیں اور اس پیالے کے بننے کا مقصد پورا ہو۔

جبر و قدر:

عقائد کے اکثر مسائل ایسے ہیں کہ اگر ان سے مذہب کو الگ کر لیا جائے تو فطرتی اور مادی سطح پر ان کے متعلق فیصلہ کرنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں ہو گا مگر جبر و قدر کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس میں سے مذہب کو الگ کر بھی لیا جائے تو اس مسئلے کو حل کرنا آسان نہیں۔ یہاں پر مسئلہ بالکل مختلف ہے کہ اگر ایک ملحد بھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہے تو اس کے لیے مشکل ہو گا اور وہ شخص اثبات اور نفی کے پہلوؤں کے درمیان پھنس کر رہ جائے گا۔اس دوران ایسے اشکالات پیدا ہوتے ہیں جن کو دور نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا کہتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان بالکل مجبور ہے تو اس کے اچھے اور برے اعمال کا کیا فائدہ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی اعمال زبردستی کروائے جائیں تو ان اعمال کے اچھے اور برے ہونے کا کیا فائدہ کیونکہ انسان نے یہ اعمال اپنی مرضی سے تو نہیں کیے۔ بر خلاف اس کے اگر دوسرے پہلو پر غور کیا جائے کہ انسان کسی فعل کو کیوں کر کرتا ہے اور کیوں کسی فعل سے باز رہتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان میں خواہش کا مادہ پیدا کیا ہے جسے ارادے سے تعبیر کرتے ہیں۔خاص مواقعوں پر یہ خواہش خود بخود نمودار ہو جاتی ہے اور انسان کو افعال سرزد کرنے پر مجبور کرتی ہے۔قوت ارادی کے مد مقابل انسان میں قوت اجتنابی بھی رکھ دی گئی ہے یعنی کہ برے کاموں سے انسان کو باز رکھنے کے لیے یہ قوت حرکت میں آجاتی ہے۔کسی کام کے کرنے اور اور اس سے اجتناب

کرنے کے لیے قوت ارادی اور قوت اجتنابی کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور پھر جو قوت غالب آجائے وہی کام ہوتا ہے۔

مولانا اس حوالے سے ایک مثال دیتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے سامنے شراب پیش کی جائے تو اس کی قوت ارادی اسے پینے پر مجبور کرے گی اور دوسری جانب قوت اجتنابی اسے باز رکھنے کی کوشش کرے گی اور پھر دونوں قوتوں میں جنگ ہوگی۔ انسان میں فطرتی طور ارادی قوت طاقت ور ہے اس طرح قوت ارادی قوت اجتنابی پر برتری حاصل کرلی گی اور یہ انسان شراب پی لے گا۔

اشاعرہ نے اپنی سمجھ کے مطابق ایک تیسری صورت بھی نکالی ہے کہ یہ اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان سے سرزد کرواتا ہے اور ان کے کرنے میں انسان کی حیثیت صرف کسب کی سی ہے اور پھر کسب کی تعریف کرنا اس لیے بھی مشکل ہے کہ کسب ایک مہمل لفظ ہے، علم کلام کی اکثر کتب میں لکھا ہے کہ اس لفظ کی حقیقت نہیں بیان کی جاسکتی اور مسلم الثبوت میں لکھا ہے کہ جبر اور کسب توام بھائی ہیں۔

مولانا نے اس مسئلے پر مختلف طریقوں اور مثالوں سے بحث کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جبریہ اور قدریہ دونوں ہی غلطی پر ہیں مگر جبریہ کے مقابلے میں قدریہ کو اس لیے برتری حاصل ہے قدریہ بداہت کے خلاف نہیں اور جبریہ بداہت کے خلاف ہے۔ قدریہ فرقے والوں کا یہ ماننا ہے کہ ہر اختیار ان کو دیا گیا ہے اور ہر امر کا حکم اللہ کی طرف سے ہے۔ مولانا نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اصل طاقت اللہ ہی کے پاس ہے مگر اس نے انسان کو بھی اختیار دیا ہے۔ مولانا بات کو اس انداز سے سمجھاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کتے کو پتھر مارتا ہے تو کتا پتھر پر نہیں بلکہ اس پر پتھر پھینکنے والے پر حملہ کرے گا۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتا بھی جانتا ہے کہ پتھر کا کوئی قصور نہیں کیونکہ وہ مجبور ہے اور جس شخص نے پتھر مارا ہے وہ قابلِ گرفت ہے۔ مولانا کا یہ ماننا ہے ہم اختیار رکھتے ہیں اور اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے بھی ہیں جیسے ہم کسی سے کوئی کام لیتے ہیں، کسی کو کوئی حکم دیتے ہیں خود کوئی کام کرتے ہیں یا کسی کو کسی

کام سے روکتے ہیں ان سب باتوں سے ہمارا اختیار واضح ہوتا ہے۔ مولانا رو نے اشعریہ اور جبریہ دونوں کو غلط ثابت کیا ہے مولانا کہتے ہیں اشعریہ کہتے ہیں سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے سو اگر وہ چاہے تو کسی کو مسلمان کرے اور جس کو چاہے کافر کرے۔ مولانا اس بات کو یہ کہہ کر رد کرتے ہیں اگر سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے تو انسان پھر نیکی اور بدی کا مرتکب کیسے ہوتا ہے باقی اختیار کیسے سرزد کرتا ہے اور دوسری طرف مولانا نے جبریہ کو یہ کہہ کر رد کیا کہ اللہ نے انسان کو مجبور نہیں کیا بلکہ اختیار دیا ہے۔

ماحصل:

مولانا روم نے مثنوی آسان اور عام فہم انداز میں لکھی ہے اور ہر مسئلے کو روزمرہ زندگی سے اور دیگر معروف تمثیلوں سے بات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا روم کا تصوف سے گہرا تعلق ہے اس وجہ سے ہر مسئلے کی جڑوں میں تصوف کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے بعض مسائل کا عقلی بنیادوں پر بھی حل پیش کیا ہے۔ توحید کے مسئلے کو بیان کرتے ہوئے مولانا نے ہمہ اوست مسلک کا پرچار کیا ہے۔

مثنوی میں روح کے تصور کو مولانا نے کس طرح پیش کیا ہے۔ یہ ہمارا موضوع تھا مثنوی کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولانا روح کی ترقی کے حمایتی ہیں مطلب مولانا روم کے نزدیک روح جب نباتات سے حیوانات اور پھر انسانیت کی طرف زینے چڑھتی جاتی ہے تو اس کی تقدیس ہو جاتی ہے۔ انسانوں میں بھی روح کے مراتب و مدارج نظر آتے ہیں مولانا کے نزدیک روح کی وجہ سے بعض انسان بعض انسانوں پر فضیلت رکھتے ہیں، اس سلسلے کی مثالوں کو مولانا اولیا اور انبیاء کی مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔ مولانا نے اس بات کو انبیاء کے لیے بنیادی خوبی قرار دیا ہے کہ نبیوں کی روح اس قدر اعلیٰ ہوتی ہے جو وہ نبوت کا بار برداشت کر پاتے ہیں۔

روح کے تصور کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک اور بات مولانا کے حوالے سے عیاں ہوئی ہے کہ معجزہ نبوت کی شرط نہیں باقی نبی کی روح ہی ایسی ہوتی ہے جس کو دیکھتے ہی سامنے والے کی روح ایمان لانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس تحقیق میں سب سے دلچسپ بات جو سامنے آئی وہ یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک دوبارہ زندگی کا تعلق بھی روح کی تقدیس کے ساتھ مشروط ہے۔ جو روحیں پاکیزگی اور مراتب کے حوالے سے اس قابل نہیں ہوں گی کہ ان کو دوبارہ زندہ کیا جائے ان کو دوبارہ انسانی جسم کا حصہ نہیں بنایا جائے گا۔ مولانا کے نزدیک ان کا خاتمہ ہی ان کے لیے عذاب ہو گا۔